رب ہمارا

ڈاکٹر عبدالسمیع

شائع کردہ

شعبہ تعلیم و تربیت

تنظیمِ اسلامی

دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی ملتان روڈ چوہنگ، لاہور۔ 53800
فون: 78-35473375(042)
www.tanzeem.org

عرض ناشر

حامداً وّ مصلیاً: 2004 میں قرآن سرکل ملتان کے زیر اہتمام شنگریلہ ہوٹل میں ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی جس میں میزبانی کے فرائض امیرِ تنظیمِ اسلامی ملتان ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی نے ادا کئے۔ اس میں تنظیم اسلامی کے مرکزی ناظم برائے رابطہ بیرون پاکستان ڈاکٹر عبدالسمیع نے ’’رب ہمارا‘‘ کے موضوع پر خطاب کیا جو بے حد پسند کیا گیا۔ بعدازاں اس خطاب کو تنظیم اسلامی کی تربیت گاہوں کے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاتی تعلق کو استوار (۱) کرنے کے سلسلے میں اس خطاب کو مفید سمجھتے ہوئے اسے تحریری شکل دے کر اولاً ماہنامہ ’’میثاق‘‘ میں طبع کروایا گیا اور اب اس کو کتابچے کی شکل میں استفادۂ عام (۲) کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ ربِّ ذوالجلال سے دُعا ہے کہ وہ اس کتابچے کو اپنے بندوں کے حق میں دنیا اور آخرت کے اعتبار سے مفید بنائے۔ آمین۔

ناظم تربیت تنظیم اسلامی

---

(۱) مضبوط (۲) عام فائدہ

اَلْحمد للہ و کفٰی والصَّلٰوۃ وَالسَّلام عَلٰی عِبادِہِ الّذِینَ اصطفٰی
اَمّا بَعْد فَأَعُوْذُ بِاللہ مِنَ الشَّیْطٰن الرَّجِیمِ ○ بِسْمِ اللہ
الرَّحْمٰن الرَّحِیْمِ ○

{اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ
الْمَلٰئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ} (حم السجدہ: ۳۰)

محترم صدرِ مجلس اور معزز خواتین وحضرات! آج مجھے صرف یاددہانی کروانی ہے اور احساس دلانا ہے ایک ایسی بات کا جو آپ حضرات کو پہلے سے خوب معلوم ہے ابھی محترم ڈاکٹر طاہر خاکوانی صاحب نے ذکر کیا کہ جب ایمان انسان کے دل میں واقعتاً جاگزیں(۱) ہوجائے تو انسان کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ وہ ایمان جس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے کیا ایک اعلیٰ سطح کے دانشور کا ایمان ہے جس سے اس کے تمام فلسفیانہ مسائل بھی حل ہوجائیں تو شائد انسان ولایت کے بھی کسی اونچے مقام پر فائز ہوجائے۔ مگر میں نے جو آیت آپ کو سنائی ہے اس کی رو سے وہ اطمینان اور سکون صرف اللہ کو اپنا رب ماننے سے ہی حاصل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ ارشاد ہوا

{اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَ بُّنَا اللہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ
الْمَلٰئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ}

بے شک وہ لوگ جو کہیں ''ہمارا رب تو اللہ ہے'' پھر اس بات پر ڈٹ جائیں تو ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے نازل ہوں گے نہ تو خائف ہو اور نہ ہی غمگین بلکہ خوشخبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

---

(۱) جگہ پکڑ لینا

قریش اور اللہ

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کا نام متعارف نہیں کروایا۔ قرآن مجید گواہ ہے کہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کو جانتے بھی تھے اور مانتے بھی۔ لیکن کیا؟

قرآن مجید کی متعدد آیات کو سامنے رکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قریش اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کا خالق، سورج و چاند کو انسان کی خدمت پر مامور کرنے والا، نیز بارشوں کا برسانے والا اور اس طرح رزق کا بندوبست کرنے والا اقرار دے کر اللہ کو ''خالقِ کائنات'' اور ''اپنا پروردگار'' یعنی پالنے والا تسلیم کرتے تھے۔ ملاحظہ ہوں سورۃ العنکبوت کی درج ذیل آیات

{وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللہُ...... (٦١)}

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا تو لازماً کہیں گے اللہ ہی نے!''

{وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ
مِنْ م بَعْدِ مَوْتِهَا لَیَقُوْلُنَّ اللہُ...... (٦٣)}

''اگر تم ان سے پوچھو کون ہے جو آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے اور اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کرتا ہے تو لازماً کہیں گے اللہ ہی''۔

سورۃ المومنون کی آیات ۸۴ تا ۸۹ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قریش اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی مانتے تھے کہ زمین اور آسمان اور اس کی ہر چیز اللہ ہی کی ہے۔ {قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٨٤) سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ}

دلچسپ بات یہ ہے قریش اللہ تعالیٰ کو ''رب'' (آقا/Lord) صرف ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مانتے تھے (زمین اور اس پر بسنے والے انسانوں کا نہیں)

{قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ (۸۶) سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ}

”آپ ان سے پوچھیے کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟
کہیں گے کہ (یہ سب کچھ بھی) اللہ ہی کا ہے“

اگرچہ یہاں بھی وہ رب کو براہِ راست نہیں حرف ”لام“ کے واسطے سے لاتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت میں بھی کچھ کمی پیش نظر ہو۔ اس کے برعکس سورہ رعد کی آیت ۱۶ میں ارشاد ہوا۔

{قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ}

”پوچھو! آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟“

یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کو حکم دیا گیا {قُلِ اللّٰهُ} (تم ہی ان کو بتادو! ”اللہ ہی“)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایسا بادشاہ مانتے تھے جس کی حکومت کچھ جاگیرداروں/ وڈیروں (Feudal Lords) کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہے۔ انسانوں کے اصل حاکم وہ ارباب/ Lords ہی ہیں۔ یاد رہے کہ رب کا لفظ (جمع: ارباب) عربی میں وڈیروں/ آقاؤں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

آج کا انسان اور اللہ

معاملہ آج بھی کچھ ایسا ہی ہے انسانوں کی عظیم اکثریت اب بھی اللہ کو کسی نہ کسی شکل میں خالق تسلیم کرتی ہے۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی خبروں کا تجزیہ کیجئے۔ مغرب اللہ کی غلامی سے آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے اور Fundamentalist (فنڈامینٹلسٹ)⁽¹⁾ مسلمان اُس کے دشمن صرف اس لئے ہیں کہ وہ انسانیت کو اللہ کی غلامی میں دھکیلنا چاہتے ہیں اور اباحیت پسند⁽²⁾ سیکولر مغرب کو یہ کسی صورت قابل قبول نہیں۔ ہمارا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ہم اگرچہ اللہ کو ”رب“ مانتے ہیں لیکن اس

---

(۱) بنیاد پرست (۲) حلال وحرام کی قید سے آزاد

کی ربوبیت کو صرف ایک ”سروس“ سمجھتے ہیں یعنی رب بمعنی ”پالنے والا“ کسی عرب ملک میں آج بھی آپ کرائے پر مکان لیں گے تو مالک مکان کو ”ربُّ الدّار“ کہیں گے۔ اللہ کے ۹۹ نام ہیں آپ نے کبھی غور کیا کہ ان میں ”رب“ شامل نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ کے تمام نام ”ال“ سے شروع ہوتے ہیں جیسے **الرحمٰن** اور **الرحیم، الودود، الستار** اور **الغفار** وغیرہ لیکن قرآن مجید میں لفظ ”رب“ ۹۰۰ سے زائد مرتبہ آیا ہے۔ مگر کبھی ”ال“ کے ساتھ وارد نہیں ہوا۔ رب کے علاوہ باقی سب صفات Services ہیں جیسے خالق صانع مصور موجد وغیرہ۔ کسی بھی بلڈنگ کا آرکیٹکٹ انجینئر بلڈر یا ڈیزائنر یا فنشنگ کے کسی مرحلے پر کام کرنے والا کوئی شخص اس بلڈنگ پر کوئی دعویٰ نہیں رکھتا۔ کلیم (Claim) صرف مالک اور رب کا ہوتا ہے اور اسی کو اپنی پراپرٹی پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

رب، خالق اور پالنے والا

جیسے عرض کیا گیا مشرکینِ مکہ اللہ کو خالق مانتے تھے لیکن اپنا رب نہیں، اسی طرح آج ہم بھی خود رب بنے بیٹھے ہیں۔ ہم میں سے کوئی اپنا خالق ہونے کا دعویدار نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ میرا آپکا اور اس زمین کا رب ہے۔ اگرچہ بلاشبہ وہ خالق بھی ہے ہمارا اور اس زمین کا۔ یاد رہے تخلیق ایک Service (سروس) ہے جس کا انتظام اللہ نے کیا کہ والدین مل کر ایک نیا فردِ نوع بشر اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے ذریعے ”Produce“ یعنی تیار کریں پھر اس کی پرورش کر کے اُسے جوان کریں اور اللہ کے حوالے کر دیں تاکہ اللہ اس سے مخاطب ہو سکے اس لئے کہ اللہ صرف عاقل اور بالغ شخص سے کلام فرماتا ہے نابالغ اور غیر عاقل سے نہیں۔ اصل خالق تو اللہ ہے لیکن اس نے Produce کرنے کا کام والدین سے لیا، اب اگر وہ میرا رب ہے تو اسی نے بطور خالق اور پالنے والے کے بھی میرے تمام مراحل کو سامنے رکھ کر ان کا بندوبست فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کا ہم پر کلیم (Claim) یقیناً خالق یا پالنے والے کی حیثیت سے نہیں، کسی

اور حیثیت سے ہے۔ آپ نے زمین خریدی، آپ چاہیں تو بیچ دیں پھر چاہیں تو اس پر عمارت بنائیں یا خالی چھوڑ دیں یا پھر اس کو کسی اور کام میں لائیں یا پھر کرایہ پر دیں یا خود استعمال کریں کیا وہ معمار جس نے آپ کی زمین پر تعمیر کی ''خدمت'' سرانجام دی اس عمارت پر کوئی Claim رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں!!! اختیار تو صرف Land Lord ہی کا ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا صرف خالق، صانع، مصور اور پروردگار/ پالنے والا ہی ہے یا ہمارا رب، سائیں، Lord اور آقا بھی۔ اس سوال پر غور کرنے سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہوجائے گا کہ ہم اللہ کو کیا سمجھتے اور مانتے ہیں۔ صرف ''پیدا کرنے والا'' اور ''پالنے والا'' جو ہماری پیدائش اور بعد کی جملہ (۱) ضروریات کا بندوبست کرنے کا پابند ہے یا اپنا ''آقا/ Lord / رب جو اس حیثیت میں ہماری تمام ضروریات کا اپنی مرضی کے مطابق بندوبست کرتا ہے۔

اصل جھگڑا؟

آیئے ایک قدم اور آگے بڑھائیں: مکہ ایک چھوٹی سی بستی تھی ملتان جیسا شہر تو نہ تھا جس میں پڑوسی بھی پڑوسی کو نہ جانتا ہو۔ لہٰذا قریش آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محمد بن عبداللہ کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان اور پیشے کے بارے میں تو خبر ہوگی ہی اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شخص انتہائی سچا بھی ہے اور دیانتدار بھی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بتوں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ صرف اِلٰہِ واحد اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کی پرستش کرتے ہیں اس کے باوجود وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حجر اسود کی تنصیب جیسے حساس معاملے میں جج بنا کر بہت خوش ہوئے اور آپ کا فیصلہ خوشی سے قبول کیا۔ گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قریش کا تا حال کوئی جھگڑا نہ تھا۔ جھگڑا تو اُس وقت شروع ہوا جب قرآن مجید کی پہلی آیت لوگوں کے سامنے آئی {اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ} (پڑھ اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) یعنی قبل ازیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اللہ کو الٰہ واحد مانتے تھے اور قریش بھی

---

(۱) تمام

سمجھتے تھے کہ یہ شخصؐ اللہ کے سوا کسی کو عبادت کے عمل/ پرستش/Act of worship کے لائق نہیں سمجھتا...... یہ تو قابلِ قبول تھا لیکن جب یہ پتا چلا کہ یہ تو اللہ کو ہمارا ابھی رب بنانا چاہتا ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں اس عزوجل کی ڈکٹیشن (۱) ہر معاملے میں قبول کرنی پڑے گی۔ اس ڈکٹیشن کی نفی ہی سیکولزم کی اصل روح ہے کیونکہ To Secularize کا ڈکشنری میں مطلب ہی کچھ یوں ہے To reduce the role of religion in morality and education" (اخلاقیات یعنی صحیح و غلط کے تعین اور نظام تعلیم میں مذہب کے عمل دخل کو کم کرنا) یعنی پرستش (Worship) میں مذہب کا عمل دخل ہو۔ کوئی اللہ کی عبادت میں جس انتہا تک چاہے چلا جائے یہاں تک کہ دنیا چھوڑ کر کسی کونے میں جا کر اللہ اللہ کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں البتہ Morality (۲) میں مذہب کو داخل کرنا ہی انتہا پسندی قرار پاتا ہے۔ مسجد میں چاہے صبح شام ''اللہ اکبر'' کا ورد کرتا رہے لیکن سڑک پر آ کر نعرہ تکبیر بلند نہ کرے۔ انتہا پسند کا لیبل تو اس شخص پر لگے گا جو اللہ کو ربّ مانتے ہوئے اس کا حکم منوانا چاہتا ہو۔ اِلٰہِ واحد ماننا جرم نہیں اور نہ ہی اللہ کو کائنات کا خالق اور پروردگار ماننا جرم ہے جرم ہے تو اللہ کو رب ماننا۔

ہم کون؟

اب دوسری طرف آیئے۔ اگر اللہ رب ہے تو ہم کون ہیں؟ قریش میں امیہ بن خلف ''رب'' تھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے ''عبد''۔ اردو میں کہیں گے امیہ ''آقا'' تھا اور بلال رضی اللہ عنہ اس کے ''غلام''۔ لہٰذا اگر اللہ ہمارا ''رب'' ہے تو ہم اس کے ''عبد'' (جمع ......عباد) ہوئے لیکن آج ''عبد'' کا لفظ اپنا مفہوم کھو بیٹھا ہے قرآن مجید کے انگریزی تراجم میں سے قدیم اور جدید تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ مختلف ملے گا جناب Pickthall لفظ ''عبد'' کا ترجمہ بلا جھجک ''Slave'' کرتے ہیں جبکہ بعد کے تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ Bondsman اور جدید تراجم میں Humble servant ملتا

---

(۱) حکم (۲) اخلاقیات

ہے حالانکہ Slave اور Servant دو علیحدہ علیحدہ حیثیتیں ہیں۔ غلامی کبھی چوائس (Choice)(۱) سے نہیں ہوتی! جبکہ سروس ہمیشہ Choice ہی سے ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کو ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ آپ ایڈورٹائز (Advertise)(۲) کریں گے کتنے ہی لوگ درخواست دیں گے ان میں سے کسی کو منتخب کر کے Proper Terms and conditions(۳) کے ساتھ آپ اس کو Job Offer(۴) کریں گے۔ ان شرائط ملازمت میں ڈیوٹی آورز (Duty Hours)(۵) اور مراعات کے ساتھ ساتھ کام کی نوعیت بھی واضح طور پر بتائی جائے گی۔ اگر اس کا دل مانے گا تو وہ آپ کی آفر کو قبول کرے گا ورنہ ٹھکرا دے گا۔ جبکہ یہ اختیار غلام کے پاس نہیں ہوتا۔ اب زمین و آسمان کا فرق واقع ہوگیا۔ اگر ہم Servants ہیں تو ہمارے ’’ڈیوٹی آورز‘‘ اور ’’حقوق‘‘ ہوں گے جبکہ اگر ہم غلام ہیں تو ہمہ وقت(۶) غلامی میں ہیں۔ صرف جاگتے ہوئے ہی نہیں سوئے ہوئے بھی اللہ کے غلام ہیں۔ نومولود (New borns) بھی غلام اور ادھیڑ عمر کے بھی غلام۔ صبح بھی غلام اور شام بھی غلام۔ اسی طرح دن کو بھی غلام رات کو بھی غلام۔ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اگر ’’ع ب د‘‘ کا مادہ باب کَرُمَ سے آئے۔ (یعنی عَبُدَ یَعْبُدُ) تو اس کے معنی ہوں گے ’’جدی پشتی غلام ہونا‘‘ اور اس سے صفت ’’عبد‘‘ ہوگی اور یاد رہے باب ’’کَرُمَ‘‘ میں وارد ہونے والے افعال/ مصادر کوئی باقاعدہ "Acts" نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس اگر یہی مادہ باب ’’نَصَرَ‘‘ سے آئے (یعنی عَبُدَ یَعْبُدُ) تو اس میں Act of worship(۷) کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کا اسم فاعل ’’عابد‘‘ بنتا ہے۔ اب ہمارے تراجم میں اس لفظ کے ترجمہ میں سے غلامی کا مفہوم نکال لیا گیا ہے اور صرف پرستش (Worship) کا مفہوم باقی رکھا گیا ہے۔ یاد رہے پرستش ایک Act(۸) ہے جس کی ہمیشہ ابتداء بھی ہوا کرتی ہے اور کوئی انتہا بھی۔ نماز کی پرستش ’’اللہ اکبر‘‘ سے شروع ہو کر ’’السلام علیکم ورحمۃ اللہ‘‘ پر ختم ہوتی ہے

---

(۱) پسند (۲) مشتہر (۳) مناسب شرائط (۴) ملازمت کی پیشکش (۵) اوقات کار
(۶) کُل وقت (۷) پرستش (۸) عمل

اسی طرح روزے کی عبادت اذان فجر سے شروع ہوتی اور اذان مغرب پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس...... اس کے برعکس غلامی کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بھی اللہ کا بندہ/ غلام ہوں اور میرے والد صاحب بھی اسی کے غلام ہیں اور میرے دادا اور پردادا بھی۔ میں غلام ہی پیدا ہوا تھا اور غلام ہی مروں گا۔ درمیان میں جب بالغ ہوا تو اللہ رب العزت نے مجھے اختیار دیا ’’چاہو تو اس حقیقت کو تسلیم کرلو اور چاہو تو اللہ کو اپنا رب ماننے اور اس کی غلامی کی زنجیر اپنے گلے میں ڈالنے سے انکار کردو۔ ہاں! مان لو گے تو عافیت پاؤ گے اور اگر تم نے انکار کیا تو انجام کے خود ذمہ دار ہو گے اس لئے کہ تمہاری میرے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے‘‘۔ اب اگر میں خود کو اللہ کا نوکر (Servant) سمجھوں گا تو میرا طرز عمل نوکروں کا سا ہوگا میں اپنا حق مانگوں گا اور اگر اللہ میری خواہش کو پورا نہیں کرے گا تو پریشان ہوں گا اس کے برعکس اگر میں اپنے آپ کو اللہ کا غلام تسلیم کرلوں گا تو مطمئن رہوں گا اللہ چاہے تو مجھے کچھ دے اور چاہے تو محروم رکھے اور بھوکا مار دے۔ جس کو چاہے خوبصورت اور تندرست پیدا کرے اور جس کو چاہے بدصورت یا عیب والا اور اسی طرح جس کو چاہے بیٹوں سے نوازے اور جس کو چاہے بیٹیوں سے اور جس کو چاہے بے اولاد رکھے۔ کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا۔ {يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ㊾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ج وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا} (سورۃ شوریٰ: ۵۰، ۴۹) اور بعینہٖ اسی طرح وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ {فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ} (سورۃ البقرۃ: ۲۸۴)۔ اگر وہ بڑے سے بڑے گنہگار کو بخش دے تو بھی اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں اور اسی حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ رب العزت کی خدمت میں روزِ قیامت عرض کریں گے {اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ} (سورۃ المائدۃ: ۱۱۸) ترجمہ: ’’اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے (تیری ہی ملکیت ہیں) اور اگر تو انہیں بخش دے تو (تجھے کوئی

پوچھنے والا نہیں) کیونکہ تو بالا دست حکمت والا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ Appointed (۱) ہوتے ہیں جیسے کوئی قوم ووٹ دے کر اپنا حاکم مقرر کرتی ہے تو وہ ان کا ’’رب‘‘ نہیں ’’خادم‘‘ ہوتا ہے اگر وہ جزاء وسزا کے فیصلے از خود اور دیئے گئے ضابطے کے خلاف کرے تو اس کی پوچھ گچھ کی جاتی ہے کیونکہ وہ Appointing authority (۲) کو جواب دہ ہوتا ہے۔

اللہ انسانوں کا رب ہے! مالک ومختار ہے! تو پھر ہم کون ہیں؟ اس کے بندے صرف اور صرف غلام!! کوئی Contract (۳) ہمارے اور اس کے درمیان Sign (۴) نہیں ہوا۔ ہمارے کوئی Privileges (۵) نہیں، کسی قسم کا کوئی استحقاق ہرگز نہیں ہے۔ وہ ہمیں کچھ دے یا بالکل محروم رکھے یہ اس کا اختیارِ مطلق ہے۔ ہمارے کوئی اوقات کار (Duty Hours) مقرر نہیں ہیں۔ ہم تو چوبیس گھنٹے کے اول روز سے آخر دم تک بلکہ قبل از پیدائش سے اللہ کے غلام ہیں جب یہ حقیقت انسان پر عیاں (۶) ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو اس کی Approach (۷) یکسر بدل جاتی ہے اور اس کو کبھی احساسِ محرومی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ محرومی کا احساس تو ہمیشہ نتیجہ ہوتا ہے اس بات کا کہ میں حقدار تھا مگر مجھے محروم رکھا گیا لیکن اگر یہ پتہ چل جائے کہ میرا تو کوئی حق سرے سے تھا ہی نہیں جس سے میں محروم کر دیا گیا تو احساس محرومی کا کیا سوال۔ احساسِ محرومی نہیں تو ذہنی تناؤ نہیں ، ذہنی تناؤ نہیں تو Depression (۸) نہیں۔ تو بات شروع ہوئی تھی سورہ حم السجدہ کی آیات سے {اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا} ’’یقینا وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب تو اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے اُترتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور نہ ہی غمگین ہو‘‘۔

---

(۱) منتخب (۲) تقرر کنندہ (۳) معاہدہ (۴) طے ہونا (۵) حقوق (۶) ظاہر
(۷) رسائی (۸) افسردگی

غلامی اور پرستش

قرآن مجید کا اصل پیغام نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کرامؑ کی اصل دعوت یہی تھی {یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہ} (اے میری قوم! اللہ کے بندے بن جاؤ) پرستش کا ذکر اس کے بعد آتا ہے۔ {مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ} (اس کے سوا کوئی اور تمہاری پرستش کے لائق نہیں ہے)۔ قرآن مجید میں جنّوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد ہی یہ بیان کیا گیا ہے۔ {وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ} (میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے بندے بن جائیں)۔ Worship (۱) تو بعد کا مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ Worship (معروف مذہبی معنوں میں پرستش) بھی ہم اس کی کیوں کریں؟ اس لئے کہ وہ ہمارا رب ہے۔ رب اس لئے نہیں ہے کہ ہم اس کی پوجا کرتے ہیں ہرگز ہرگز نہیں!! بلکہ اسے پوجتے اس لئے ہیں کہ وہ ہمارا رب ہے۔ ان دونوں کے درمیان بھی ترتیب کچھ یوں دکھائی دیتی ہے کہ اللہ کو رب ماننا تو دین کا Ultimate (۲) تقاضا ہے جبکہ اللہ کو اِلٰہ واحد (The Only One Worthy of worship) ماننا دین کا ابتدائی اور کم سے کم تقاضا ہے بلکہ دینِ اسلام میں داخلہ اللہ تعالیٰ کو ’’الٰہ واحد‘‘ ماننے کا بھی صرف ’’اقرار‘‘ کرنے سے ہو جاتا ہے۔

اسی سے کیوں مانگیں؟

جب انسان کسی سے یہ رشتہ Establish (۳) کرے کہ وہ میرا رب، میرا سائیں، میرا مالک ومختار ہے تو پھر وہ اُسی سے مانگتا ہے۔ ذرا سوچئے! غلامی تو دور کی بات ہے میں آپ کے ہاں مہمان بن کر جاؤں اور آپ کا ملازم یا نوکر آپ کی موجودگی میں میرے سامنے اپنا دکھڑا بیان کرنے بیٹھ جائے اور مجھ سے مدد کا خواستگار (۴) ہو تو آپ کو کتنا بُرا لگے گا حالانکہ وہ آپ کا غلام نہیں صرف ملازم ہے جبکہ ہم تو اللہ کے بندے

---

(۱) پرستش (۲) حتمی (۳) قائم کرنا (۴) طلبگار

اور غلام ہیں لہٰذا جب ہم اللہ کو چھوڑ کر اسی کی مخلوق میں سے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے تو اُسے کیسا لگے گا؟ تو بندگی اور غلامی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم صرف اپنے ربّ ہی سے مانگیں اور صرف اور صرف اُسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں ہمارا اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانا بنتا ہی نہیں۔ سورہ الفاتحہ کو دیکھئے ایک تو یہ پہلو کہ قرآن کی نازل ہونے والی پہلی آیت کی طرح مصحف کی پہلی آیت میں بھی اللہ کو بطور ''رب'' متعارف کروایا گیا ہے اور ایک دُعا کی شکل میں اللہ رب العالمین کی حمد وثناء کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ چونکہ تُو رب العالمین ہے لہٰذا {اِيَّاكَ نَعۡبُدُ} ہم بھی صرف تیرے ہی بندے ہیں اور اسی لئے {اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ} تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اللہ سے مانگنے کی بنیاد اگر اس کا معبود ہونا ہو تو وہ ایک غیر مناسب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ''پرستش'' اللہ کی ضرورت نہیں ''مدد'' ہماری ضرورت ہے اور اے اللہ میں نے تیرے حضور دو سجدے کئے ہیں تو بھی مجھے دو روپے دے۔ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے۔ {اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ} کا ترجمہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' کرنے سے بھی ایسا ہی تاثر ملتا ہے اس کے برعکس آپ یہ کہیں ''اللہ! تو میرا رب، میں تیرا بندہ۔ میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں لہٰذا تجھ ہی سے مانگ رہا ہوں'' اب یہ بات ٹھیک بیٹھ گئی۔

Direction⁽۱⁾ بھی اسی سے

{اِيَّاكَ نَعۡبُدُ} (اے اللہ ہم تیرے ہی بندے ہیں) لہٰذا {اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ} (ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور اب مدد میں سب سے Important⁽۲⁾ چیز کیا ہے؟ Direction! کہ بتا پھر ہم کدھر جائیں۔ یہ کام کریں یا وہ یا کوئی تیسرا۔ اور یہ ہے {اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۝ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ} (ہمیں سیدھا راستہ دکھا، یعنی ان لوگوں کا

---

(۱) رہنمائی (۲) اہم

راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ تیرے غضب کا نشانہ بنے اور نہ ہی گمراہ ہوئے) مانگنا بھی انسان اپنے مالک سے ہے اور زندگی گزارنے کا راستہ بھی اسی سے پوچھتا ہے۔ کیونکہ زندگی گزارنے کا طریقہ وہ خود معین⁽۱⁾ نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ لطیف نکتہ بھی اہم ہے کسی بے جان ''خط مستقیم''، نہیں ایسے ''صراط مستقیم'' کی جانب راہنمائی طلب کی گئی ہے جس کی منزل صرف رب العالمین کی خوشنودی ہے۔ لہٰذا سچ اس لئے نہیں بولنا کہ وہ اچھا یا مفید عمل ہے بلکہ اس لئے بولنا ہے کہ اس سے ہمارا رب ہم سے راضی ہوتا ہے۔ اگر ربِّ عزوجل اپنے کسی بندے کو بذریعہ وحی کسی ایسے کام کا بھی حکم دے جو عام حالات میں جائز نہیں جیسے بیٹے کا بلا وجہ قتل یا جھوٹ بولنا تو بھی اس پر اپنے رب کے حکم کی تعمیل لازم ہوتی کیونکہ ہم سچائی یا احترامِ آدمیت کے بندے نہیں ربُّ العالمین کے بندے ہیں۔ اسی لئے جب حضرت یوسفؑ کو ربِّ کریم سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے لئے تجویز کر دیا کہ خود ہی پیالہ بھائی کے تھیلے میں رکھ کر اسے ''چور'' بنا ڈالو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا تقاضا وہی تھا جو انہوں نے کیا۔

پیشی بھی اسی کے حضور

لیکن انسان کی ایک کمزوری ہے اور یقیناً یہ کمزوری اس کے رب ہی نے اس کے اندر رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان بھول جاتا ہے اور پہلی وحی میں وارد شدہ⁽۲⁾ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بعد فرمایا {كَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓى} (نہیں! یقیناً انسان سرکش ہو ہی جاتا ہے) کیونکہ {اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى} (وہ اپنے آپ کو بے پرواہ پاتا ہے) کوئی Check⁽۳⁾ نہیں! دو طرح کی باتیں اسے معلوم تھیں کچھ تو طبعی حقائق تھے جیسے ''آگ جلاتی ہے'' اور ''آلودہ کھانا کھانے سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے'' انسان کا تجربہ یہ ہے کہ اگر بھول کر بھی اس نے گرم گرم دودھ یا چائے کا گھونٹ بھر لیا تو اس کا تالو اور زبان جل گئے۔ اسی طرح اس نے غلطی سے بھی آلودہ کھانا کھایا تو اس کا

---

(۱) مقرر (۲) نازل شدہ (۳) روک ٹوک

پیٹ خراب ہوا۔ ساتھ ہی اس کے علم میں کچھ اخلاقی ضابطے تھے جیسے ‘‘جھوٹ بولنا بُری بات ہے’’ اور ‘‘کسی دوسرے کا مال کھانا ظلم ہے’’ یہاں انسان کا تجربہ بالکل مختلف ہے یعنی وہ جان بوجھ کر بھی جھوٹ بولے تو اس کی زبان پر چھالا نہیں پڑتا اور اسی طرح اگر وہ صریحاً(۱) بھی کسی دوسرے کا مال ہڑپ کر جائے تو اس کے پیٹ میں کوئی درد نہیں ہوتا۔ تو رب العالمین ہمیں ہمارے تجربے کا Allowance(۲) دیتا ہے {کَلَّآ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰٓی o اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی} اس لئے کہ اس میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کوئی پوچھنے والا نہیں لہٰذا فرمایا {اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجۡعٰی} (تجھے یقیناً اپنے رب کے حضور لوٹنا ہے) کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ No Check(۳) سے دھوکا نہ کھانا۔ تو یقیناً اپنے رب کے حضور لوٹایا جائے گا، یہاں بھی لفظ ‘‘رب’’ آیا ہے۔ پیشی کس کے سامنے ہے؟ جس کو بھی انسان سمجھتا ہے کہ وہ مجھ پر مکمل اختیار اور کنٹرول رکھتا ہے انسان کے دل میں اصل ڈر بھی اسی کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بڑی Organizations(۴) جیسے Mills(۵) میں خاص طور پر ہوتا ہے کہ ‘‘فلاں’’ ‘‘میاں صاحب’’ کا خاص بندہ ہے۔ جنرل منیجر کو بھی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ جی ایم صاحب بھی میاں صاحب ہی کے Employee(٦) ہیں جی ایم کو اُنہی نے Hire(۷) کیا ہے اور وہی اس کو جب چاہیں نکال بھی سکتے ہیں۔

غلامی سے بغاوت

حقیقت یہ ہے کہ انسان غلطی بھی کرتا ہے اور اس میں سرکشی کا رجحان(۸) بھی ہوتا ہے لہٰذا انسان سے لامحالہ(۹) اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب ہوتا ہی رہتا ہے، اگرچہ وہ اللہ کو اپنا رب تسلیم کرتا ہوگا۔ میرا بڑا گہرا احساس ہے کہ قرآن شہری نہیں، دیہاتی اور قبائلی زبان میں نازل ہوا ہے۔ شہر میں رہنے والا ہر شخص تقریباً Independent(۱۰) ہوتا ہے لیکن جوں جوں آپ دیہاتوں میں اندر چلے جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ وڈیرے ہیں اور یہ ان کے کمی کاری قسم کے ‘‘شہری’’ ہیں حالانکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ملکی قانون کے مطابق وہ بھی آزاد شہری ہیں لیکن ہوتا کیا ہے وڈیرے اپنے ملازموں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور جب تک کوئی وڈیرا کسی ملازم کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ اُسی کا بندہ ہے ‘‘He is sincere to him’’(۱) تو وڈیرا اس کی بڑی بڑی غلطیوں کو بھی نظر انداز کرتا ہے اور ایک خاص انداز میں اس کو اپنے پاس بلاتا ہے اور ملازم سائیں! سائیں! چوہدری جی! چوہدری جی! کہتا ایک مخصوص انداز میں ہاتھ ماتھے پر رکھتا ہے۔ جواباً وڈیرا اس کو دو تین گالیاں دیتا ہے اور کبھی ایک آدھ ٹھوکر بھی لگا دیتا ہے اور یوں معاملہ رفع دفع(۲) ہوجاتا ہے۔ لیکن جب اس وڈیرے کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے فلاں ملازم نے اسے چھوڑ کر اس کے کسی ‘‘شریک’’ یعنی کسی دوسرے وڈیرے سے سازباز(۳) کی ہے اور اس کی وفاداری کا دم بھرا ہے یا بالفاظ دیگر اسے اپنا رب مانا ہے تو اب اگر اس وڈیرے کا بس چلے تو اس ملازم کو جان سے مروا دے گا۔ اُسے برداشت نہیں کرے گا۔

---

(۱)اعلانیہ (۲)رعایت (۳)روک ٹوک نہ ہونا (۴)تنظیمیں (۵)کارخانے (٦)ملازم
(۷)اجرت پر رکھنا (۸)میلان (۹)چارونا چار (۱۰)آزاد

رب تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی بخشش

اس سے معلوم ہوا کہ اصل Offence(۴) نافرمانی نہیں!! اس لئے کہ نافرمانی تو ہو ہی جایا کرتی ہے وہ تو حضرت آدم سے بھی ہوگئی لہٰذا اگر تو نافرمانی صرف ‘‘نافرمانی’’ ہے بغاوت یا Rebellion نہیں ہے تو وہ قابل معافی ہے اسی لئے حضرت آدمؑ کو فوراً معافی مل گئی اور رب تعالیٰ کے لئے اس بات کو Establish(۵) کرنا ہرگز مشکل نہیں ہے کہ کوئی چھوٹی یا بڑی نافرمانی بغاوت پر مبنی ہے یا صرف بھول چوک ہے۔ دو افراد نافرمانی کر رہے ہوں تو یہ بھی امکان ہے کہ ان میں ایک بڑے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر رہا ہو اور دوسرا کوئی ہلکا جرم۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ ہلکا جرم کرنے والا وہ جرم Out of Rebellion یعنی بغاوت کی بنیاد پر کر رہا

---

(۱)وہ اس سے مخلص ہے (۲)ختم (۳)سازش (۴)جرم (۵)تعین کرنا

ہے جبکہ دوسرا شخص اگرچہ کوئی بڑا اجرم کررہا ہے لیکن بھول کر، جذبات کی رو میں بہہ کر یا صرف کاہلی کی بنیاد پر۔ لہٰذا جب تک رب تعالیٰ کے علم کے مطابق کوئی شخص اس کو اپنا رب تسلیم کررہا ہے تو اس کی بخشش کا امکان ہے اگرچہ یہ بھی بندے کا ''حق'' ہرگز نہیں ہے، اللہ کی رحمت وعنایت ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص اللہ کو اپنا رب ماننے ہی سے انکار کردے تو پھر وہ کسی رعایت کا حقدار نہیں رہتا یہ راز نہ کھلے تو قرآن مجید میں اللہ کی بخشش اور اجر وثواب کے حصول کے لئے عمل صالح کے ساتھ یا اس کے بغیر ''ایمان'' کی شرط سمجھ میں نہیں آتی اور یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ Out of turn(۱) رعایتی معاملہ کیا جائے گا اور غیر مسلموں کے ساتھ بلاوجہ امتیازی سلوک۔

اہم کیا......ایمان یا عمل؟

مزید برآں(۲) انسان جس کا بندہ ہوتا ہے اسی کی Cause(۳) کو Promote(۴) کرتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ بندہ تو کسی ایک کا ہو اور وہ کسی دوسرے کی Cause کو Promote کرے۔ لہٰذا وہ صبح شام دن رات، سوتے جاگتے کھڑے بیٹھے ہر صورت میں اسی کے لئے کام کرتا ہے اور ہر صورت میں اپنے آپ کو اسی کا بندہ کہتا ہے۔ اللہ کو اپنا رب مان لینے والا، دنیا میں بادشاہ بھی بن جائے تب بھی کہے گا ''اِنِّیْ عَبْدُ اللہ'' میں اللہ کا بندہ ہوں، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے تذکرے میں آپ نے یہ بات نوٹ کی ہوگی جب ان کا نام نہاد مالک امیہ بن خلف ان پر تشدد کرتا تھا تو ان کی زبان پر ''احدٌ احدٌ'' کے الفاظ آتے تھے۔ یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو کیا کیا نتائج برآمد ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاتے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہوگا اور خیانت اور وعدہ خلافی بھی کیونکہ یہی بنیادی اخلاقی تعلیمات ہیں۔ اب میں فرض کررہا ہوں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے نام نہاد آقا کے پاس آئے اور کہا ''صاحب!

---

(۱) بلا استحقاق (۲) اس سے بڑھ کر (۳) مقصد/ مفاد (۴) ترقی دینا

میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کی خدمت میں قبل ازیں کوتاہی کرتے ہوئے خیانت کا مرتکب ہوتا رہا ہوں لیکن آج میں عبداللہ کے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آیا ہوں لہٰذا آج سے میں آپ کو دھوکا نہیں دیا کروں گا'' اس پر امیہ دل ہی دل میں خوش ہورہا ہوگا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''لیکن اب آپ میرے رب نہیں ہیں'' اس پر اُمیہ بھنّا کر بولا ہوگا ''تیری ایسی دی تیسی توں ایہہ کہن والا ہونا کون ایں(۱) How dare you say that!''(۲) تو اصل ردعمل تو اس بات پر ہے ورنہ اگر بات صرف اخلاق پر ختم ہوجاتی جیسا کہ آج Promote کیا جارہا ہے اور ایمان کی بجائے عمل کی بات کی جارہی ہے جیسے ''ہم سے تو وہ کافر اچھے ہیں جو بڑی دیانتداری سے معاملہ کرتے ہیں'' غور کیجئے اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ یاد رکھئے عمل کے اعتبار سے کمزور ترین مسلمان بھی عمل اور اخلاق کے اعتبار سے بلند ترین غیر مسلم سے افضل ہے۔

Employer(۳) کی اصل ضرورت

حالانکہ Employer (مخدوم) کی اصل ضرورت ایک Dutyful employee (فرض شناس ملازم) ہوا کرتی ہے آپ کو اپنی دکان یا دفتر کے لئے کسی ملازم کی ضرورت ہے تو آپ کسی دیانتدار شخص کو تلاش کریں گے کہ وہ آپ کی عدم موجودگی میں کیش پر بیٹھ سکے اور آپ کے مفاد کا تحفظ کرسکے اور آپ حسب منشاء آرام بھی کرسکیں اور اپنی معاشرتی ذمہ داریاں بھی نبھا سکیں مزید برآں اپنے کاروبار کو وسعت بھی دے سکیں فرض کیجئے آپ کو دو آدمی آپ کی Job کے مناسب ایسے مل جاتے ہیں جن میں سے ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہو لیکن ساتھ ہی آپ کے علم میں یہ بات بھی آجائے کہ مسلمان بددیانت اور غیر مسلم نہایت دیانتدار ہے تو آپ خواہ کتنے ہی اچھے مسلمان اور اسلام کے کتنے ہی شیدائی ہوں آپ غیر مسلم کو ملازم رکھیں گے اور

---

(۱) تو یہ کہنے والا ہوتا کون ہے؟ (۲) تجھے یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ (۳) ملازمت دینے والا

اس کو اس کی عبادت کے لئے چھٹی بھی دیں گے۔ تو امیہ بن خلف بھی ہرگز بے وقوف نہ تھا۔ اس نے حضرت بلال ؓ پر تشدد اس لئے کیا کہ انہوں نے اس کو رب ماننے سے انکار کر دیا ورنہ اگر وہ اس کو رب مانتے ہوئے صرف ایک اللہ کی پرستش کی اجازت مانگتے تو شاید وہ خوش ہو کر اجازت دیتا۔

اگر اللہ ہمارا رب ہے تو

جب ہم نے اللہ کو اپنا رب مان لیا تو مسجد میں ہوں یا گھر پر، زمین پر ہوں یا سمندر اور فضا میں، ہم معمولی مزدور ہوں یا کسی ملک کے صدر یا وزیر اعظم ہر وقت اور ہر جگہ یہی کہیں گے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں اور اسی کی Cause کو پروموٹ کریں گے اور جبکہ وہ شفیق اور مہربان بھی ہے اور ستار و غفار بھی تو ہم اس کے لئے کہاں تک جائیں گے؟ ملاحظہ ہو سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۶۲

{قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ}

’’کہہ دو میری نماز میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہیں‘‘۔

رب العالمین کی طرف سے پہلا تقاضا نماز ہے پھر تقاضا ہر قسم کی قربانی ہے یعنی اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے سب کچھ قربان کرنا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسی کے لئے جینا اور اس کے لئے مرنا۔ گویا صبح شام اس کی خاطر کام کرتے ہوئے گزریں گے۔

اگر ہم اسی کے ہیں تو

قرآن مجید کا ہر جملہ بڑا Meaningful (۱) ہے۔ {اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ} (ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) جیسے! بیٹا فوت ہوا۔ قبل ازیں وہ بیٹے کو اپنی Property (۲) سمجھتا تھا کہ یہ میرا ذاتی مال ہے میرا

---

(۱) بامعنی (۲) ملکیت

Asset (۱) ہے۔ اب اگر یہی سمجھتا رہا کہ وہ میری چیز تھی اور مجھے اس سے محروم کر دیا گیا تو روتا رہے گا چیختا اور کڑھتا رہے گا۔ لیکن جونہی اسے یہ بات یاد آئے گی کہ ہم تو خود اللہ کے ہیں تو پکار اُٹھے گا {اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ}۔ اسی طرح اگر یہ سبق یاد ہے تو جو کچھ بھی ملے گا اللہ ہی کا عطیہ اور اس کی امانت نظر آئے گا اور کوئی چیز ہاتھ سے نکل جائے تو کوئی رنج ہوگا اور نہ ہی غم۔ اسی طرح مستقبل کی بھی کوئی فکر کہ ’’کل کیا ہوگا‘‘ ہرگز نہ ہوگی کیونکہ کائنات کو اللہ چلا رہا ہے اور وہ اپنا کام خوب جانتا ہے اور وہ میرا رب ہے لہٰذا وہ میرے مفاد کا مجھ سے بڑھ کر تحفظ کرے گا۔ میرا کام صرف اس کا کہنا ماننا اور اس کے مشن کے لئے تن من دھن لگانا ہے۔

ایک غلط فہمی:

رب تعالیٰ کے ساتھ ذاتی تعلق کو پیش نظر نہ رکھنے کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے تحت الشعور (۲) میں یہ غلط فہمی اپنی جگہ بنا لیتی ہے کہ اللہ اصل میں تو مولویوں، پیروں، پنڈتوں، پادریوں اور رِبّیوں کا ہے لہٰذا ہمیں اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے لئے لازماً ان کا سہارا لینا ہوگا۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل (۳) رہیں پردے
پیرانِ کلیسا (۴) کو کلیسا سے اُٹھا دو (اقبالؔ)

اس کے برعکس اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم و محکوم، خواص و عوام، بڑوں اور چھوٹوں، مردوں اور عورتوں، زمینداروں اور کاشت کاروں، سرمایہ کاروں اور مزدوروں، گوروں اور کالوں، غرض تمام انسانوں کا ’’یکساں رب‘‘ ہے اور ان کا یہ تعلق بلا واسطہ ہے لہٰذا ہر انسان اللہ رب العزت کو ہر وقت ہر جگہ اور ہر حال میں براہِ راست پکار سکتا ہے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید میں وارد شدہ ’’مناجات‘‘ میں تو اگرچہ اَللّٰھُمَّ کا خطاب مل جائے گا لیکن میری یادداشت کی حد تک کوئی ’’دُعا‘‘ جس میں اللہ سے کچھ مانگنا پیش نظر ہو اَللّٰھُمَّ سے شروع نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ’’رَبَّنَا‘‘ (ہمارے رب) یا

---

(۱) اثاثہ (۲) ذہن (۳) رکاوٹ (۴) راہب۔ مذہبی پیشوا

’’رَبِّ‘‘ (اے میرے رب) کے لفظ سے شروع ہوتی ہے۔

رب کی پناہ

last but not the least (۱) ہم قرآن مجید کی نازل ہونے والی پہلی آیت اور قرآن کے Text کی پہلی آیت تو پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کو بطور ’’رب‘‘ متعارف کروایا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انسان انتہائی کمزور ہے خود کو اللہ کی طاقتور مخلوق کی کھلی اور مخفی کارروائیوں کے سامنے بے بس پاتا ہے لہٰذا قرآن مجید کے اختتام پر ہر قسم کے کھلے اور مخفی خطرات سے محفوظ ہونے کے لئے اپنے ’’رب‘‘ ہی کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ....اور............ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ

بہت سے بیرونی خطرات انسان کو پریشان کرتے ہیں کوئی جادو نہ کر دے کوئی جسمانی یا مالی نقصان سے دوچار نہ کر دے، ایسے میں کہو ’’**اعوذ برب الفلق... الی الآخر**‘‘ اور اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ Every thing will be OK،(۲) دوسری طرف کچھ خطرات اندرونی بھی ہیں نفس اور شیاطین جن و انس! اندر گھس کر شرارتیں کر رہے ہیں اور دل کو بُرائی کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ اگر انسان کو احساس ہو کہ اس نے بڑی ریاضتیں کی ہیں لیکن بُرائی دور نہیں ہوئی۔ ہم اپنے اندر جھانکیں تو محسوس ہوگا کہ باقی تو دور کی بات ہے صرف نظر ہی کنٹرول نہیں ہوتی اور بدنظری تو زنا کے ابتدائیوں میں سے ایک ہے، جو زِنا تک لے جاتی ہے لہٰذا احساس ہوگا کہ میں تو مارا گیا۔ علیٰ ھٰذا القیاس...... ایسے میں کہو ’’**اعوذ برب الناس... الی الآخر**‘‘ اور لوگوں کے رب کی پناہ میں آ کر خود کو مامون و محفوظ سمجھو! علاوہ ازیں جب بھی شیطان چوکائے (۳) تو فوراً بھاگو اپنے رب کی طرف {وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ} (سورہ حم السجدہ: ۳۶)

---

(۱) آخری ضروری بات

(۲) سب کچھ ٹھیک ہوجائے

(۳) اکسائے

لہٰذا اللہ کو پہچاننا کہ وہ میرا رب ہے اور خود کو پہچاننا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں میرے نزدیک یہی قرآن مجید کا بنیادی پیغام ہے اور اسی کی یاددہانی کے لئے میں آپ کی خدمت میں آج حاضر ہوا ہوں۔

آخر میں آپ سے میں کوئی لمبا چوڑا تقاضا نہیں کرتا، صرف یہ گذارش کروں گا کہ آج رات تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل ہی دل میں اللہ سے خطاب کرتے ہوئے دو جملے ضرور کہئے ’’اے اللہ تو میرا رب ہے، میں تیرا بندہ ہوں‘‘ اور لذت وسُرور کا بےنظیر تجربہ کیجیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(اور ہماری آخری پکار یہ ہے کہ تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے)